شاعرِ آتش دیدہ

یامین

سنا ہے کہیں ایک جنگل تھا۔ برف میں سویا ہوا۔ دھند میں لپٹا ہوا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے قصبے کا ایک نوجوان ۔۔۔خالص کھرا پٹھان ۔۔ بانسری کی تان کے پیچھے اپنے طلسماتی پہاڑی شہر سے نکلا اور اس جنگل میں گم ہو گیا۔۔۔ ایسا گم ہوا کہ برسوں کسی کو خبر نہ ہوئی۔ اس جنگل کا سارے موسم اُس پر بیتے۔۔۔ چھ ہزار سے اوپر راتیں ۔۔۔ اور اتنے ہی دن۔ برسوں اُس کے تن پر سورج چمکا، آتش برسی۔ جانے کتنے ساون بھیگے۔ پیلے گلابی پتوں والے پت جھڑ بیتے۔ نرم و گرم مست بہاریں مہکیں۔ پھول کھلے، کچھ خواب کھلے، کچھ پھولوں کے رنگ جلے۔ کہیں کہیں تو رنگوں کی بہتات سے ایسی آگ لگی ۔۔۔۔۔ سارے خواب اِس آگ میں جل کر راکھ ہو گئے۔

اس جنگل میں منشی کا آرا بھی چلتا رہا اور قینچی کی آواز دلوں کو کاٹتی رہی۔ نیلم نیلم پربت، دریا اور ہوا کے گیت جدائی میں بھی سوسو رنگ بکھرتے ۔۔۔ اور کبھی طوفانی برف باری میں سب کچھ دَب کر برف کا تودا بن جاتا۔

اس جنگل پر سب کچھ بیتا۔۔۔ لیکن وہ اس جنگل سے باہر نہ نکلا۔ دھند میں لپٹا جنگل اس کے خوابوں کا مسکن تھا۔ اس بن باس میں اس نے پورے سترہ سال کاٹے۔

آج اچانک ۔۔۔ وہ اپنی اوک میں آگ لے کر، دھند میں لپٹے جنگل سے نمودار ہوا ہے۔۔۔ تو ہم نیچے کھڑے اُس کو یوں دیکھتے ہیں جیسے کوئی مہاتما کسی تپسیا کے بعد بستی کی طرف آرہا ہو۔ ہم متجسس جو انتظار میں بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ آج اس آگ سے چہرے لال کر کے شاعری کی ایک یادگار شام روشن کریں گے۔ یہ شام دھند میں لپٹے جنگل سے نمودار ہوئی ہے۔ اور سترہ برس کے جوگ سے ایسی آگ کما کر لائی ہے جس سے دلوں کی برف پگھلتی ہے، زندہ پانی کا جھرنا پھوٹتا ہے اور زندگی نیلی سبز جھیل کی کہانی سے نکل کر ہماری جانب بہنے لگتی ہے۔

ہم دسمبر کی اس یخ بستہ شام میں اپنی اپنی اوک میں آگ ڈالے، گرما گرم باتیں سنیں گے اور شاعری کے مزے دار چلغوزے چٹخائیں گے۔ ہم اپنی اوک میں آگ سے روشنی لے کر غموں کے سیاہ بادلوں پر بجلی چمکائیں گے اور نیلے آسمان پر چاند ستارے ٹانکیں گے۔

آیئے ۔۔۔ میں آپ کو ''اوک میں آگ'' کے پاس لے کے چلتا ہوں۔ لیکن پہلے ۔۔۔۔ میں آپ کو اس کتاب سے تھوڑی دور ۔۔۔ باہر روک کر کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اندر آگ ہے اور باہر برفاب۔۔ ایک لفظ سے یہ آگ جل سکتی ہے اور برفاب جھلس سکتا ہے۔۔۔ لفظ کی طاقت ایٹم سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔

آج آپ کشمیر لٹریری فورم کے مہمان نہیں ہیں۔ یہ دعوت آپ کو الفاظ نے دی ہے۔ الفاظ جو معاشرت کی روح، سماجیات کی جان اور زندہ چیز ہیں۔۔۔ ایک چھوٹا سا اقتباس، حسن عسکری مرحوم کے ایک کالم سے آپ کو سنانا ہے۔

''الفاظ اُس آدمی کو یاد ہوتے ہیں جو زندہ ہو یعنی جسے زندگی کے عوامل اور مظاہر سے جذباتی تعلق ہو۔ ہم آپ جیسے عام آدمی جو الفاظ بولتے ہیں اُن میں ہماری پوری جسمانی، ذہنی اور جذباتی سوانح عمری بند ہوتی ہے۔ ہم کتنے اور کس قسم کے الفاظ پر قدرت حاصل کر سکتے ہیں اِس کا انحصار اس بات پر ہے کہ ہمیں زندگی سے رابطہ کتنا ہے۔ اگر کوئی سکڑ سمٹ کر اندر بند ہو جائے تو اسے لفظوں کی ضرورت ہی نہ پڑے۔

شیکسپیر نے 26 ہزار الفاظ استعمال کیے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ چیزوں اور انسانوں کی دنیا سے چھبیس ہزار طرح متاثر ہوا تھا۔

ایک سیدھا سادا اور بذاتِ خود مہمل سا لفظ ''اور'' استعمال کرنے کا مطلب ہے کہ آدمی کی شخصیت میں اتنی لچک ہے کہ وہ اپنی دلچسپی ایک چیز سے دوسری چیز تک منتقل کر سکے اور اس کے اندر اتنی گیرائی ہے کہ وہ بیک وقت دو چیزوں کا احاطہ کر سکے۔ بہت سے لوگوں کی شخصیت ٹھٹھر کے رہ جاتی ہے تو اسی لیے کہ وہ اپنی روح کی گہرائیوں میں ''اور'' کہنے کی ہمت نہیں رکھتے۔

ادیبوں کے پاس لفظ کم رہ جائیں تو پورے معاشرے کو گھبرا جانا چاہیے، یہ تو ایک بہت بڑے سماجی خلل کی علامت ہے۔

باعمل لوگ ادب جیسی بے مصرف چیز سے ہزار بیگانہ رہیں لیکن ان کی نبض ادب میں دھڑکتی ہے۔ ادب میں لفظوں کا توڑا ہو جائے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ معاشرے کو زندگی سے دلچسپی نہیں رہی۔

جب ادب مرنے لگے تو ادیبوں ہی کو نہیں بلکہ سارے معاشرے کو دعائے قنوت پڑھنی چاہیے۔''

آج الفاظ نے آپ کو دعوت دی ہے کہ دیکھیں کہیں ہم اس بحران کی لپیٹ میں تو نہیں۔ اب آپ چاہیں تو اس کتاب کے لفظوں کی حدت اور جدت سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں جو احمد حسین مجاہد ہمارے لیے لے کے آئے ہیں۔

''اوک میں آگ'' کی شاعری جو مجموعی تفہیم پیش کرتی ہے وہ ایک نئی زندگی ہے جو انسانی سماج کے اثبات سے پیدا ہوتی ہے۔ احمد

حسین مجاہد بنیادی طور پر نیم فلسفیانہ مزاج کا شاعر ہے۔اس لیے اس کی شاعری میں مضامین کے بلند برجوں اور میناروں پر نظر سب سے پہلے پڑتی ہے۔بعد میں کہیں کسی گلی، کسی کھڑکی، کسی دریچے، کسی صحن، کسی چلمن، کسی آنکھ، کسی رخسار سے نظریں ملتی ہیں۔ناصر عباس نیر نے اس کتاب کے دیباچے میں اپنی تحریر کی بنیاد اسی حقیقت پر رکھی ہے اور شاعر کی مضمون آفرینی کو مختلف شعروں میں نمودار ہوتے دکھایا ہے۔مجھے اس بات سے اتفاق ہے کہ آگ اور اس کے متعلقات سے شاعر نے کئی مفہوم نکالے ہیں لیکن بنیادی بات یہی ہے کہ ''آگ''ایک نئی حیات کی تخلیق کا ایک ذریعہ بن کر سامنے آتی ہے۔آبِ حیات سے روایتی مفہوم کے تحت جو ابدی زندگی عطا ہو سکتی ہے وہ ایک ہی روش پر چلنے والی ہے جب کہ آگ ایک روش کی زندگی کا خاتمہ کر کے ایک نئی طرز کی زندگی کا آغاز کرتی ہے۔

میں مسافر تھا طلب کرتا اگر آبِ حیات

اوک میں بھر کے مجھے آگ پلائی ہوتی

لے گیا کوئی رسالت کوئی اعجازِ ہنر

میں نے اے کاش اگر آگ ہی لائی ہوتی

آگ سے احمد حسین مجاہد نے نہ صرف حیاتِ نو کے چراغ روشن کیے ہیں بلکہ اپنی شاعری میں طرح طرح کے مضامین بھی پیدا کیے ہیں۔

کرتے ہیں عشق ایک تغافل شعار سے

ہم برف میں کچھ آگ ملائے ہوئے تو ہیں

بے درد طلوع ہو کہیں سے

اب آگ بہت بھڑک گئی ہے

اور یہ طلسم دیکھیے جس میں مادہ اور روح عجب طلسماتی کھیل کھیل رہے ہیں:

جب اُس نے چھوا میں ایک پل میں

مٹی سے چراغ بن گیا تھا

آگ سے نکالے ہوئے یہ دو شعر بھی دیکھ لیجیے:

کسی نے آگ میں گوندھا ہے برسوں میری مٹی کو

بدن کے ریشے ریشے میں اک آئینہ چمکتا ہے

چھت پر چڑھا تھا ڈوبتے سورج کو تھامنے

پھر اپنی آگ میں وہ جلا تھا مری طرح

زبان و بیان کی ہنرمندی اور مضامین و خیال کی ثروت مندی کے ساتھ ساتھ محض امیج سازی سے بھی احمد حسین مجاہد نے بھی شاعری کو مزین کر کے دکھایا ہے۔

بے حد Graphic یعنی تصویری مفہوم اِن شعروں میں دیکھا جا سکتا ہے:

دائم آباد محفلِ یاراں

میں ابھی گھر سے ہو کے آتا ہوں

سلسلہ ملنے ملانے کا رہا جاتا ہے

اب اگر کوئی ادھر آئے تو آ جاتا ہے

اور یہ شعر دیکھیے جس میں ایک کلیدی لفظ ''طاق'' سے شاعر نے دیے کا امیج جلایا۔۔۔لیکن دیے کا لفظ استعمال کیے بغیر:

میں تنگ آ کے جو آغوشِ طاق سے نکلا

ہوا نے بھی تہہِ داماں چھپا لیا مجھ کو

یہاں ہوا کو **animate** کر کے ایک اور امیج بھی بنایا گیا ہے جیسے ایک اور شعر میں قدموں کی چاپ کا ایک امیج بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔لفظ ''جاتی''، پر غور کرنے سے امیج کی حرکت نظر آتی ہے۔

جاتی نہیں ہے میرے دریچے سے دور چاپ

یعنی میں اپنے حسنِ گماں کا شکار ہوں

ایک کیفیت یعنی چاپ کو animate کر کے لفظ ''جاتی'' کے ذریعے situation کو تسلسل عطا کر دیا ہے اور مضمون میں اس کو بھی وہم قرار دے کر یہ حقیقت بھی سمجھا دی ہے کہ انسان اس وہم کا شکار ہو کر ہی زندہ رہ سکتا ہے۔

اچھے سے اچھا لکھنے والے بھی گھڑنے کا کام کرنے لگتے ہیں جس سے معنی کا اکہرا پن سامنے آ جاتا ہے۔اگر شعر کی ترسیل میں انسانی ذہن دریافت اور تجسس کی مشکل سے نہیں گذرتا تو ایسی تحریر کے بارے میں اچھی رائے قائم نہیں کی جا سکتی کیونکہ شاعری زندگی کو دیکھنا، سمجھنا اور نت نئے ڈھنگ سے دکھانے کا نام ہے۔۔۔اور یہ کام توفیق کے بغیر نہیں ہو سکتا۔

مجاہد کو اگر توفیق ملی ہے تو اس وجہ سے بھی کہ وہ اقبال سے روشنی کی ایک شعاع لے کر آیا ہے اور ''تو غنی از ہر دو عالم، من فقیر'' میں ڈوب کر یہ چمکتے ہوئے مصرعے نکال کر لے آیا ہے:

تو غنی ہے دو جہاں سے، میں فقیرِ راہگزار
روزِ محشر لاج رکھ لینا مری پروردگار
پھر بھی جو لازم ہو میرے دفترِ عصیاں کی جانچ
مصطفیٰ کا سامنے کرنا نہ مجھ کو شرمسار

☆۔۔۔مظفر آباد میں منعقدہ ایک تقریب میں پڑھا گیا۔